

استنباط احکام کے بنیادی اصول: ایک تعارف

Principles of Deriving Islamic Rulings: An Introduction

☆ ڈاکٹر قاری تاج افسر

ABSTRACT

The Qur'an serves as the basic source of Islamic laws. These laws encompass all gamut of human life. The Prophet (s.a.w.) applied certain principles in deriving legal rulings from the Qur'an. The Companions after him not only continued with the same principles but also expanded their scope. After them their disciples (tabiyen) perfected the principles of deriving legal rulings from the Qur'an. When the Muslim jurists (fuqaha) came on the stage to play their role, the principles of deriving Islamic laws from the sacred source became more elaborate. This article introduces the contributions of the Last Prophet (s.a.w.), the Companions, their disciples, and Muslim jurists toward the development of principles of how to derive legal rulings from the Qur'an.

قرآن حکیم کتاب ہدایت ہے اور اس کے نزول کا مقصد انسانیت کے جملہ مسائل کا حل پیش کر کے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم کرنا ہے۔ اس کی عالمگیریت ایک طرف جبکہ دوسری طرف اس کا نزول عربی زبان میں ہوا اور عربوں کے تہذیب و تمدن اور ان کے اسلوب پر نازل ہوا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربوں کو اس کے سمجھنے اور اس سے مسئلہ اخذ کرنے کے حوالے سے کوئی دقت پیش نہیں آئی لیکن غیر عرب اقوام کے لئے یہ کام نہایت مشکل تھا۔ حکمت قرآنی کا تقاضا تھا کہ عربی اسلوب میں اپنے انداز بیان کو لپیٹ کر فطرت انسانی کو بیدار کیا جائے تاکہ عربی تمدن کے پس منظر میں جو حقیقت پنہاں ہے اس تک رسائی حاصل ہو سکے اور انسانی سماج جس وحدت پر قائم ہے اور جو اس کے فطری رجحانات ہیں اس کے ذریعے قرآنی احکام کو سمجھا جائے اور اس کی عالمگیریت کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ اس مقصد کے لئے نبی اکرم ﷺ نے قرآن حکیم کے عام کی تخصیص کی، مطلق کی تقیید

☆ اسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

کی، عبارة النص سے اشارة النص کو اخذ کرتے ہوئے مسائل کی جزئیات حل کیں اگر قرآن حکیم کا استنباط کے ساتھ لزوم کا تعلق نہ ہوتا تو وہ محض ایک جامد اور چند لوگوں کیلئے اندھی عقیدت کی اساس پر تو شاید قابل قبول کتاب ہو جاتی لیکن انسانیت عامہ اس سے پہلو تہی کارو یہ اختیار کر لیتی۔ اس مقالے میں قرآن حکیم کا اور استنباط کا باہمی ربط و تعلق اور اس کی تاریخ، نیز ائمہ اربعہ تک کے اصول استنباط پر بحث کی گئی ہے اور مثالوں سے ان کے شمرہ اختلاف کو واضح کیا گیا ہے۔

استنباط کا لغوی و اصطلاحی مفہوم:

استنباط "نبط" سے مشتق ہے اور یہ کسی چیز کے نکالنے کے معنی میں آتا ہے استنبطت الماء کا معنی ہوتا ہے استخراج الماء سین استفعال میں طلب کا معنی ہونے کی وجہ سے معنی یہ ہوگا کہ پانی کو خفیہ جگہ سے طلب کیا گیا استنباط کا مفہوم یہ ہوا کہ کسی چھپی ہوئی چیز کو منظر عام پر لانا۔ استنبط الفقیہ کا معنی ہوگا کہ فقیہ نے کسی مسئلہ میں جدوجہد کر کے نصوص کے اندر سے چھپے ہوئے مسئلہ کو ظاہر کیا اور نکالا ہے۔ فلان یستنبط من الکلام اس وقت کہا جاتا ہے جب کلام کے ظاہر سے ایسا مفہوم نکالے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل ہو (۱) قرآن حکیم میں ہے ﴿وَلَوْ رَدُّوهُ إِلَى الرَّسُولِ وَاللّٰی اُولٰٓئِیْ اَلْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْهُمْ﴾ [النساء ۸۳] یعنی یستخرجونہ منہم۔

استنباط کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔

”استخراج المعانی من النصوص بفرط الذهن وقوة القریحة“ (۲)

یعنی ذہانت اور سلیم الفطرتی طاقت سے نصوص کے اندر چھپے ہوئے معانی کو نکالنا۔ لغوی اور اصطلاحی مفہوم میں مطابقت واضح ہے۔

استنباط اور اجتہاد:

اجتہاد کے لغوی معنی کسی بات کی تحقیق میں انتہائی جدوجہد کرنا۔ عرب کے ہاں یہ لفظ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کوئی کام محنت شاقہ کا طالب ہو اور اس میں جدوجہد کی جائے (۳) اجتہاد کی اصطلاحی تعریف یہ ہے۔ ”هو استفرغ الجهد وبذل غاية الوسع اما فی درك الأحكام الشرعیة واما فی تطبیقها“ (۴) یعنی دو مقامات پر استنباط میں اپنی پوری قوت صرف کر دینا اجتہاد ہے ایک ان مسائل میں جو پہلے موجود نہیں ہیں ان کا حل دریافت کرنا دوسرے وہ مسائل جو موجود ہیں ان کا موقع محل متعین کرنا۔

استنباط اور اجتہاد کے درمیان نسبت عمل اور نتیجے کی ہے کہ استنباط خفیہ مسائل کو ظاہر کرنے کا نام ہے اور یہ نتیجہ ہے اجتہاد کا اور اجتہاد اس جدوجہد کا نام ہے جس کے ذریعے سے استنباط کیا جاتا ہے اور یہ عمل ہے استنباط کرنے کیلئے۔

مقصد نزول قرآن اور استنباط:

قرآن حکیم اپنے نزول کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہتا ہے ﴿كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ﴾ [ابراہیم ۱] ہم نے اس کلام مجید کو اس لئے اتارا کہ آپ لوگوں کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف نکالیں یعنی انسانی زندگی کے تمام الجھاؤ چاہے وہ سیاسی ہوں معاشی ہوں فکری انتشار پر مبنی پیچیدگیاں ہوں یا تہذیب و تمدن کی تشکیل میں مسائل درپیش ہوں ان مسائل میں نور فراہم کرنا راہنمائی دینا قرآن حکیم کے نزول کا مقصد اصلی ہے۔ چونکہ کل انسانی نوع کے مسائل یکساں اور ایک دوسرے سے مربوط ہیں تو قرآن حکیم نے ان مسائل کا حل انسانی اساس پر پیش کیا ہے کسی گروہ یا خاص افراد پر مشتمل طبقہ ہی اس کا مخاطب نہیں ہے۔ اس کیلئے قرآن حکیم فرد کی شعوری زندگی سے لیکر ازدواجی، خاندانی، قومی، عالمی اور پھر خاندانوں، قوموں کے درمیان معاشی لین دین قوموں کے درمیان صلح و جنگ کے مسائل، امن و امان قائم رکھنے کے اصول، جبر و تشدد کے خاتمے کے مسائل میں نیز انسان اور اللہ کے مابین تعلقات کے حوالہ سے مکمل راہنمائی فراہم کرتا ہے۔ ان تمام مسائل میں عدل و انصاف کل انسانیت کا تقاضا ہے لہذا ان اصول پر انسانی سماج کی تشکیل بجائے کسی گروہ یا فرقہ کے کل انسانیت کے حق میں نتائج پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح یہ کتاب مقدس ہدیٰ للناس بن کر سامنے آتی ہے اور ان مسائل کے حل پر مشتمل علم ”علم الاحکام“ کہلاتا ہے۔

علم الاحکام کی حکمتیں، نتائج اور ان کی ترغیب و ترہیب اور اہمیت سمجھانے کیلئے کبھی تاریخ، سے کبھی تغیرات کونیہ سے اور کبھی اعمال کے نتائج مرتب ہونے سے قرآن حکیم استدلال کرتا ہے اور کبھی بے عمل لوگوں کے رویوں کی تفصیلات بیان کر کے ان سے بچنے کی تاکید کرتا ہے۔ قرآن حکیم کا نزول جاز میں ہوا اور اس کے اولین مخاطب عرب تھے اس لئے اس تمام تر افہام و تفہیم کیلئے لب و لہجہ عرب کے عادات و اطوار کو سامنے رکھ کر اختیار کیا گیا ہے نبی اکرمؐ نے بحیثیت مفسر قرآن اس قرآن کے دیئے گئے اصول کی روشنی میں حکمت عملی طے کی اور اسے عملی جامہ پہنایا چونکہ آپ کی یہ ساری عملی تطبیق اجتماعی عمل کے ذریعے سے تکمیل پذیر ہوئی اس لئے حضورؐ کی تربیت کے نتیجے میں جماعت کے فقہاء صحابہ نے بھی آپؐ کی ہی طرز پر استدلال، اجتہاد اور قیاس کر کے

قوانین مستتب کئے۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبلؓ (متوفی ۱۸ھ) کو جب نبی اکرمؐ نے یمن کا گورنر بنایا تو پوچھا، معاذ فیصلے کیسے کرو گے؟ تو فرمایا: کتاب اللہ سے، حضورؐ نے پوچھا اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو؟ فرمایا رسول اللہؐ کے اسوہ حسنہ سے، پوچھا اگر آپ کو میری سنت سے بھی وہ فیصلہ نہ ملے تو؟ فرمایا اجتہد برائی و لال کہ میں اجتہاد و استنباط کے ذریعے مسئلہ نکالوں گا تو حضورؐ نے شاباش دی اور فرمایا ((الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ كَمَا يَرْضَى رَسُولَ اللَّهِ ﷺ)) (۵)

ترجمہ: کہ تمام تعریفیں اس اللہ کیلئے ہیں جس نے رسول کے قاصد کو یہ توفیق دی ہے کہ وہ مسائل کا حل نکال کر رسول اللہ ﷺ کی رضا کا باعث بن رہا ہے۔

نبی اکرمؐ کی حضرت عمرؓ کے متعلق شہادت موجود ہے جس میں آپ نے فرمایا تھا ((لَقَدْ كَانَ فِيمَا كَانَ قَبْلَكُمْ مِنَ الْأُمَمِ مُحَدُّ ثُونَ فَإِنْ كَانَ مِنْ أُمَّتِي أَحَدٌ فَعَمَّرْهُ)) (۶) کہ پہلی امتوں میں بھی الہامی لوگ گذرے ہیں اور اگر میری امت میں یہ منصب کسی کیلئے مقدر ہے تو عمر کیلئے ہے اور آپؐ کی اصابت رائے کی بابت رسول اللہؐ نے فرمایا ((إِنَّ اللَّهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلَى لِسَانِ عُمَرَ)) (۷) کہ اللہ تعالیٰ نے حق کو عمرؓ کی زبان پر جاری کر دیا ہے۔

من جملہ ان اجتہادات کے ایک معرکہ الآراء استنباط عراق کی مفتوحہ زمینوں کے بارے میں ہے جس پر ایک سال تک مجلس مشاورت میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا، ایک رائے یہ تھی کہ اس کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے دوسری رائے یہ تھی کہ مرکزی بیت المال کو مالی طور پر مستحکم کرنے کیلئے مستقل آمدنی کا اسے ذریعہ بنایا جائے۔ دونوں اطراف سے دلائل اور بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر کار حضرت عمرؓ کے اس آیت ﴿كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ﴾ [الحشر ۷] سے استنباط کی بنیاد پر ارضی عراق کو تقسیم نہ کرنے پر تمام صحابہ کرامؓ کا اتفاق ہو گیا۔ (۸)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا شمار بھی ان فقہاء صحابہ کرامؓ میں ہوتا ہے جو خلیفہ کے ساتھ بطور مشیر رہتے تھے۔ چنانچہ عراق کی فتح کے بعد مشرقی اقوام کے ساتھ رابطے اور فوجی حکمت عملی کے پیش نظر جب ایک مرکزی ضرورت پیش آئی تو ساتھ عراق میں بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں اسلامی قانون کو مرتب کرنے کی فکر بھی لاحق ہوئی۔ اس مقصد کی تکمیل کیلئے حضرت عمرؓ نے ابن مسعودؓ کو بطور معلم اور استاد کے وہاں بھیجا۔ عراق کے مختلف مراکز میں جو قوانین مستتب ہوئے ان تمام کے پیچھے ابن مسعودؓ کی صحبت اور تربیت کا فرما تھی عراق کے مرکزی شہر

کوفہ والوں کو حضرت عمرؓ نے بطور خاص یہ اہمیت بتائی کہ میں عمار بن یاسرؓ کو امیر اور ابن مسعودؓ کو معلم اور وزیر بنا کر آپ لوگوں کے پاس بھیج رہا ہوں۔ یہ رسول اللہؐ کے معزز صحابہ میں سے ہیں تمہیں چاہیے کہ ان دونوں کی پیروی کرو اور ان کی بات سنو میری خواہش تو یہ تھی کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کو اپنے سے جدا نہ کروں لیکن میں نے تمہاری ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم جانا۔^(۹)

حضرت عائشہؓ اور حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے فقہی استنباطات اظہر من الشمس ہیں اور حضرت عائشہؓ تو بے شمار صحابہؓ کی استاذ ہیں۔ مدینہ منورہ کی مسند علم و فقہ کو ان حضرات کے اجتہادات اور تفقہ سے چار چاند لگے۔ یہ وہ خیر القرون کا زمانہ جس میں نبی اکرمؐ نے قرآن حکیم سے مفصل مسائل مستنبط کئے اور پھر آپ کے صحابہ کرامؓ نے اسی انداز سے مسائل کا استنباط جاری رکھا اور انسانی سوسائٹی کو تعلیمی، سیاسی اور معاشی اعتبار سے ترقی دی۔ قرآن حکیم سے یہ استنباط سنت کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے حنفیہ کے نزدیک سنت کا مفہوم خیر القرون کے استنباطات تک وسیع ہے۔^(۱۰) اور اسی خیر القرون کے مشیران فقہائے صحابہؓ حجازی فقہ اور عراقی فقہ کے مؤسس بنے۔ تابعین کے دور میں حجازی فقہ کو فقہائے مدینہ یعنی فقہائے سبجہ^(۱۱) کے ذریعے وسعت ملی اور اس کو امام مالکؒ نے مدون کر دیا جبکہ عراقی فقہ کو علقمہ (۶۲ھ) ابراہیم نخعی (۹۵ھ) حماد (۱۲۰ھ) اور امام ابو حنیفہ (۱۵۰ھ) کے ذریعے وسعت ملی جس کو قاضی ابو یوسف (۱۸۳ھ) نے کتاب الخراج کے عنوان سے مدون کر دیا اور دوسری طرف امام مالک سے موطا میں استفادہ کرنے والے امام ابو حنیفہ کے شاگرد محمد بن حسن شیبانی (۱۸۹ھ) نے دونوں اساتذہ کے علوم کو عراقی عرف و مزاج کی مناسبت سے مدون کر دیا جو موطا محمد، کتاب الآثار جیسی کتب میں محفوظ ہے۔ اس طرح گویا حجازی فقہ اور عراقی فقہ کی اساس خلفاء ثلاثہؓ کے وہ سیاسی، اقتصادی اور فکری استنباط ہیں جو انہوں نے رسول اللہؐ کے زیر تربیت سیکھے تھے اور ان پر تمام صحابہؓ کا اجماع تھا مولانا عبید اللہ سندھی (۱۹۴۴ء) اس کی وضاحت یوں فرماتے ہیں قرآن مجید کی حیثیت قانون اساسی کی ہے۔ یہ غیر متبدل ہے رسول اللہؐ کی صحبت اور تعلیم سے اس قانون اساسی پر عمل کرنے والی صحابہؓ کی ایک جماعت تیار ہوئی تھی جسے قرآن میں ﴿السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالْأَنْصَارِ﴾ [التوبة ۱۰۰] کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اس جماعت نے قرآن کی روشنی میں اور اس سے استنباط کر کے جو تمہیدی قوانین بنائے وہ بھی سنت میں داخل ہیں۔ یہ جماعت حضرت عثمانؓ کی شہادت تک متفق اور متحد رہی ان کا یہ دور خیر القرون کہلاتا ہے (۱۲) مزید فرماتے ہیں حضرت عثمانؓ کے بعد قرآن و سنت اور اس خیر القرون کے اجماعی فیصلوں کی اساس پر ہر زمانے کیلئے

نئے نئے بانی لاز (قوانین) بنتے رہے ان بانی لاز بنانے والوں کو قرآن نے ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
بِإِحْسَانٍ﴾ [التوبة: ۱۰۰] کا نام دیا ہے ان بانی لاز میں زمانے اور عرف کے تغیرات کو مد نظر رکھتے ہوئے
تبدیلیاں لائی جاتی رہیں گی اور نئی نئی پیش آنے والی صورتوں کے متعلق پہلے احکام سے مزید قاعدوں کا استخراج
ہوتا رہے گا اس کا نام فقہ ہے (۱۳) الغرض قرآن حکیم اور علم فقہ کا باہمی تعلق نظریہ اور عمل کا ہے اور یہ دونوں لازم و
ملزوم ہیں۔

قرآن اور فقہاء کے اصول استنباط:

قرآن حکیم عربی اسلوب میں نازل ہوا اور عربی تمدن کے تناظر میں اس نے انداز کلام اختیار کیا ہے۔
جب اسلام غیر عرب اقوام میں پہنچا تو یہ مسئلہ درپیش ہوا کہ ہر قوم کے سوچنے کا ایک انداز ہوتا ہے، ان کا اپنا طرز
تکلم ہوتا ہے، تمدن کے اختلاف سے اظہار خیال کے طور طریقے اور عرف مختلف ہوتے ہیں۔ ضرورت تھی کہ
قرآن حکیم کے خطاب کو فطرت انسانی تک رسائی دینے کے لئے اصول و ضابطے وضع کئے جائیں۔ ظاہر ہے کہ
اصول وضع کرنے والے کے ہاں بھی ایک تمدن اور اس کا معیار ہوتا ہے نیز ذہنی وسعت اور زمانی و مکانی اثرات
سے بھی وہ قواعد و ضوابط ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ اس لئے صحابہ کرامؓ کے ہاں بھی فقہی جزئیات میں اختلافات
ملتے ہیں اور یہی چیز آگے چل کر تابعین و تبع تابعین میں نمایاں ہو کر مسلک کی صورت اختیار کرتی ہے اور ہر
علاقے اور عرف کی ایک مستقل فقہ وجود میں آتی ہے۔ فقہ جازمی اور فقہ عراقی کی صورت میں متعدد مکاتب فکر
ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ قواعد و ضوابط کے وضع کرتے ہوئے کس عرف کا کس انداز سے لحاظ رکھا گیا اور مسائل
کے استنباط کے اصول اور تقاضے کس عرف میں کیا تھے؟ اس فصل میں ان کا بیان ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ اور اصول استنباط:

نبی اکرم ﷺ نے بحیثیت مفسر اور مجتہد اعظم استنباط احکام کی طرف متعدد طرق سے راہنمائی فرمائی۔
چنانچہ آپؐ نے مجمل کی تفسیر کی، کبھی مشکل کی وضاحت کی، کبھی عام کی تخصیص کی اور کبھی مطلق کی تفسیر کی۔

۱۔ مجمل کی تفسیر:

قرآن حکیم نے احکام کے اشارات دیئے اور نبی اکرم ﷺ نے اپنے عمل کے ذریعے اسکا
ڈھانچہ مکمل کر دیا۔ چنانچہ نماز کے حوالے سے اشارات قرآنیہ ملاحظہ ہوں

۱۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فِيْ مَنَازِكِ قِيَامٍ كَمَا حَكَمَ هِيَ كَسِيْ ثَائِمٌ مَّبِيْلٌ كَا ذِكْرٌ نِّهَيْسُ هِيَ۔
 ۲۔ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَا نَتْ عَلٰى اَلْمُوْمِنِيْنَ كِتَابًا مَّوْقُوْتًا۔ (النساء ۱۰۳) بیشک نماز مسلمانوں پر وقت کی قید کے ساتھ فرض کر دی گئی ہے۔ اس آیت سے ثائم مبیل کی طرف اشارہ ہے۔
 ۳۔ فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ جِيْنَ تُسُوْنُ وَ جِيْنَ تُصْبِحُوْنَ۔ وَ لَهٗ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَ جِيْنَ تَظْهَرُوْنَ (الروم ۱۷، ۱۸) پس پاکی ہے اللہ کیلئے اور آسمانوں و زمین میں اسکے لئے ستائش ہے جب تم پر شام آتی ہے اور جب تم پر صبح ہوتی ہے اور جب دن کا آخری وقت ہوتا ہے اور جب تم پر دو پہر ہوتی ہے۔
 اس آیت میں تسبیح کا ذکر ہے اور تسبیح قلب و لسان و جوارح تینوں سے ہوتی ہے اور نماز میں بھی ان تینوں کا ذکر ہے۔

اسی لئے مفسرین نے اس سے مراد نمازی ہے۔

۴۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ لِذُلُوْكَ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ اللَّيْلِ وَ قَرٰنِ الْفَجْرِ۔ اِنَّ قَرٰنَ الْفَجْرِ كَا نَ مَشْهُوْدًا (الاسراء ۷۸) اے پیغمبر ﷺ نماز قائم کر سورج کے ڈھلنے کے وقت سے لیکر رات کے اندھیرے تک (یعنی ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے وقتوں میں) نیز صبح کی تلاوت قرآن (یعنی صبح کی نماز) بلاشبہ صبح کی تلاوت قرآن ایک ایسی تلاوت ہے جو دیکھی جاتی ہے۔

۵۔ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ۔ وَ مِّنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَ اذْبَارَ السُّجُوْدِ (ق ۲۹-۳۰) یعنی طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہئے اور کچھ رات کے وقت اس کی تسبیح کیجئے اور نمازوں کے بعد بھی۔

۶۔ نَبِيُّ اللّٰهِ كَوَكَلَمٍ هِيَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاَبْكَارِ۔ (المومن ۵۵) حضرت زکریا علیہ السلام کو کلمہ ہوا وَ سَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاَبْكَارِ (آل عمران ۴۱) ان آیات میں کہیں نماز کی تصریح اور کہیں تسبیح و تحمید ہے اور نمازوں کے اندر بھی یہی مطلوب ہے

۷۔ حَافِظُوْا عَلٰى الصَّلٰوةِ وَالصَّلٰوةِ الْوَسْطٰى۔ (البقرہ ۲۳۸) یعنی تمام نمازوں کا اہتمام کرو اور بالخصوص درمیانی نماز کا۔ ان اشارات کو جمع کیا جائے تو نماز کے پانچ اوقات متعین ہو جاتے ہیں۔

امام رازی (۶۰۶ھ) فرماتے ہیں والصلاة الوسطى يدل على شئى أزيد من الثلاثة و

للازم التكرار، والأصل عدمه۔ ثم ذلك الزائد يمتنع أن يكون أربعة والأفليس لها وسطى فلا بدو

أن ينضم إلى تلك الثلاثة عدد آخر يحصل به للمجموع وسط وأقل ذلك أن يكون خمسة فهذه الآية دالة على وجوب الصلوات الخمسة بهذا الطريق۔ یعنی الصلوة الوسطی (درمیانی نماز) تین سے زیادہ کسی چیز پر دال ہے۔ ورنہ تکرار لازم جائے گا۔ حافظو اعلی الصلوات میں جمع کا صیغہ بھی تین پر دال ہے اور مکرر ذکر بغیر وجہ کے معیوب ہوتا ہے۔ پھر یہ زائد چار نہیں ہو سکتے کہ اس میں درمیانی نماز کا تعین نہیں ہو سکتا اس لئے لازمی ہے کہ تین پر اضافہ دو نمازوں کا ہو، تا کہ ان نمازوں میں ایک وسطی ہو۔ تو معلوم ہوا کہ کم از کم نمازیں پانچ ہوں۔

اسی طرح نماز کے ارکان کے حوالے سے بھی قرآن حکیم نے اشارات دیئے ہیں مثلاً،

۱۔ وَ قُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (البقرہ ۲۳۸) ۲۔ ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ۔۔ (الحج ۷۷)

۳۔ فَاقْرَأْهُ وَامَّا تيسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ (المزمل ۲۰) ۴۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

(البقرہ ۱۴۴)

اور دیگر آیات سے نماز کا ڈھانچہ نبی اکرم ﷺ نے متعین فرمادیا۔

۵۔ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ (الواقعه ۷۴) ۶۔ سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى (الاعلیٰ) (۱۵)

۷۔ وَرَبِّكَ فَكَبِيرٌ (المدثر ۳)

اور اس طرح کی دیگر آیات سے نماز میں تسبیحات اور تکبیرات متعین ہوئیں۔

ایک رکعت پر نماز کا اطلاق نہیں ہو سکتا تو کم از کم نماز دو رکعات پر مشتمل ہوگی۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں۔ فرضت الصلوة رکعتین رکعتین فاقرت فی السفر وزیدت فی الحضر^(۱۶) یعنی نماز دو رکعت کی صورت میں فرض ہوئی سفر کی حالت اسی کو بحال رکھا گیا اور حضر کی حالت میں اضافہ کر کے چار کر دیا۔ اسی طرح نماز میں مقام عبودیت کا سب سے زیادہ اظہار سجدہ میں ہوتا ہے اسکو ہر رکعت میں دو مرتبہ کر دیا گیا^(۱۷) اسی انداز میں اجمال کی تفسیر روزہ، زکوٰۃ اور حج میں بھی ہے۔

۲۔ مشکل کی وضاحت:

الف۔ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ [البقرہ

۱۸۷] میں بظاہر سفید دھاگے اور کالے دھاگے میں تمیز کرنا فجر ہونے کی علامت ہے جہاں سے روزے کا آغاز ہوتا ہے جبکہ اس کے لئے مکمل روشنی درکار ہے تو نبی اکرم ﷺ نے اس کی وضاحت فرمادی کہ سفید دھاگے سے

مراد صبح کی سفیدی اور کالے دھاگے سے مراد رات کی تاریکی ہے۔ (۱۸)

ب۔ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا لِحُسْنَىٰ وَ زِيَادَةً (یونس ۲۶) زیادۃ کی وضاحت مطلوب ہے جسکو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ احسنی سے مراد جنت ہے اور زیادہ سے مراد دیدار الہی ہے (۱۹)۔

ج۔ وَ أَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ (الانفال ۶۰) قوت کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ کس چیز کی اور کس درجہ کی ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا الا ان القوة الرمی (۲۰)

۳۔ عام کی تخصیص:

﴿الَّذِينَ ءَامَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا ءَايْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ﴾ [الانعام ۸۲] میں ظلم کا لفظ عام ہے اجتماعی ظلم کو بھی شامل ہے اور اعتقادی ظلم کو بھی شامل ہے صحابہ کرامؓ نے اسی عموم کی وجہ سے تردد کا اظہار کیا کہ ”اینالم یظلم نفسه؟“ تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی تخصیص کر دی کہ اس سے مراد اعتقادی ظلم یعنی شرک ہے اور دلیل میں حضرت لقمانؓ کا قول پیش کیا ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ [لقمان ۱۳] (۲۱)

۴۔ مطلق کی تقیید:

جیسے ﴿وَالسَّارِقِ وَالسَّارِقَةِ فَاقْطَعُوا آيْدِيَهُمَا﴾ [المائدة ۳۸] میں یہ مطلق ہے حضور ﷺ نے پہلی دفعہ دایاں ہاتھ کاٹا ہے جب خیار بن عدی بن نوفل بن عبدمناف پر اسلام میں سب سے پہلی چوری ثابت ہوئی (۲۲) تو دائیں ہاتھ کی تقیید اس سے ثابت ہوئی۔

صحابہ کرامؓ اور اصول استنباط:

رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں قانون کا مرکز آپؐ کی ذات اطہر تھی۔ اس لئے احادیث مبارکہ میں آپؐ سے مختلف اصول استنباط معلوم ہوتے ہیں آپؐ نے جماعت صحابہؓ میں بھی حسب درجات یہ صلاحیت منتقل کی۔ چنانچہ اس جماعت نے حالات کی گہرائی کو سمجھتے ہوئے قرآن و سنت سے مسئلہ اخذ کرنے کی صلاحیت پیدا کر لی۔ جماعت صحابہؓ میں صحبت اور صلاحیتوں کے تفاوت نیز حالات کے واسطہ پڑنے کے اعتبار سے بھی مسئلہ کے استنباط میں تفاوت تھا مثلاً:

چار خلفاءؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ، معاذ بن جبلؓ، ابی بن کعبؓ اور زید بن ثابتؓ اجتہاد کرنے میں دیگر صحابہ کرامؓ سے نمایاں تھے۔ گویا ان حضرات میں بھی اجتہاد کے درجات میں تفاوت تھا مثلاً

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اجتہاد سے زیادہ کام لیتے تھے۔ جبکہ حضرت ابو بکرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت زید بن ثابتؓ کے اجتہاد کا دائرہ اتنا وسیع نہ تھا۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

۱۔ ذوق اجتہاد میں تفاوت کہ کسی کا ذوق اجتہاد قوی تھا اور کسی کا کم۔

۲۔ اجتہاد کے مواقع میں تفاوت کہ کسی کو اجتہادی مسائل سے زیادہ سابقہ پڑا تھا اور کسی کو کم۔

حضرت ابو بکرؓ کا دور چونکہ انقلاب نبویؐ کے استحکام کا دور تھا لہذا ان حالات میں نئے مسائل کم پیش آئے اور اجتہاد کی ضرورت زیادہ نہ تھی۔ حضرت زید بن ثابتؓ اور حضرت ابی بن کعبؓ زیادہ تر مدینہ منورہ میں ہی رہے ان کو نئے مسائل سے وہ واسطہ نہیں پڑا جو دوسرے فقہاء صحابہؓ کو پیش آئے۔

حضرت عمرؓ کا دور نئی فتوحات اور اسلام کی وسعت کا دور تھا آئے دن نئے سے نئے مسائل سامنے آتے اور باہمی مشاورتیں ہوتیں جس سے اجتہاد کو وسعت ملی۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ جو عراق جیسے بین الاقوامی سنگم کے حامل علاقے میں تھے۔ وہاں نئے سے نئے مسائل پیش آتے رہے اور اجتہاد میں وسعت پیدا ہوتی رہی۔ اس لئے حضرت عمرؓ نے وہاں کیلئے ابن مسعودؓ کو منتخب کیا۔ صحابہ کرامؓ کے پیش نظر اصول استنباط میں چند امور تھے۔

۱۔ قرآن و سنت میں پیش آمدہ مسئلے کا صریحاً یا اشارتاً تذکرہ موجود ہو تو اس کو بنیاد بنانا جیسے زمین کے نظم و نسق کے بارے میں حضرت عمرؓ کا آیت فے سے استدلال اس کا مفصل تذکرہ گزر چکا ہے۔

۲۔ اشیاء و نظائر پر قیاس کرنا جیسے حضرت ابو بکرؓ نے مانعین زکوٰۃ کے حوالے سے نماز پر قیاس کرتے ہوئے اس کو فتنے کی اساس قرار دیا۔

۳۔ انسانی سوسائٹی کے عرف کا تفاوت۔ چونکہ قرآن حکیم عربی میں نازل ہوا اور اس نے عرب تمدن کو اساس بنا کر قریش کو پہلے درجے میں مخاطب کیا لیکن دوسری اقوام کے اپنے اپنے تمدن تھے۔ ان کے ماحول میں قرآنی تعلیمات کی روح کیسے قائم کی جائے؟ اس کا دار و مدار انسانی سہولیات اور ارتقاات پر ہے۔ جس سوسائٹی میں جس انداز سے آسانی ہوگی اس کی اساس پر مسائل مستنبط کئے جائیں گے۔ (۲۳)

صحابہ کرامؓ میں تفاوت اجتہاد کے اسباب:

صحابہ کرامؓ میں سے جو درجہ اجتہاد پر فائز تھے ان کے اجتہاد میں کمی یا کثرت کے علاوہ اجتہاد میں تفاوت بھی تھا جس کے اہم اسباب یہ ہیں۔

- ۱۔ ایک ہی آیت سے دو مختلف حکموں کا ثابت ہونا جیسے قرآن حکیم کی یہ آیت جب نازل ہوئی ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدہ ۳] تو تکمیل دین کو خوش خبری سمجھتے ہوئے صحابہ کرامؓ خوش ہو رہے تھے، لیکن حضرت عمرؓ نے لگے ان سے جب سبب پوچھا گیا تو فرمایا کہ ((سابعدا الکمال الانقص)) یعنی کمال دلیل زوال ہوتا ہے گویا اس میں نبی اکرم ﷺ کے وصال کی خبر معلوم ہو رہی ہے اور ایسا ہی ہوا اس کے بعد آپ ﷺ صرف ۱۸ دن دنیا میں تشریف فرما رہے۔ (۲۴)
- ۲۔ موقع محل کی تعیین کے بارے میں اختلاف: جیسے ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ احزاب سے واپسی کے موقع پر ارشاد فرمایا ((لا یصلین احد العصر الا فی بنی قریظہ)) تو صحابہؓ کے ایک طبقے نے راستے میں عصر کی نماز ادا کی۔ اس استدلال پر کہ حضور ﷺ کی مراد اس سے یہ ہے کہ جنگ احزاب والے مقام سے جلد نکلا جائے دوسرے طبقے کی رائے یہ تھی کہ حضور ﷺ نے بنو قریظہ میں ہی نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے چنانچہ انہوں نے نماز مؤخر کر دی جب حضور ﷺ کے سامنے اس کا ذکر ہوا تو آپ ﷺ نے کسی پر بھی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا۔ (۲۵)
- ۳۔ حدیث نبوی ﷺ کی اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے اختلاف: یہ فطری طور پر مسلم ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ ہمہ وقت موجود نہیں ہوتے تھے تو کسی نے حضور ﷺ سے کوئی حدیث سن لی اور کسی کو اس کے متعلق اطلاع نہیں ہوئی جس کی وجہ سے آراء کا اختلاف ہو جانا یقینی ہے جیسے رسول اللہ ﷺ کے وصال کے وقت سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کے مسئلہ پر صحابہ کرامؓ کی مشاورت ہو رہی تھی مہاجرین کا خیال تھا کہ خلافت ہمارا حق ہے کہ ہم نے وطن چھوڑا، شروع سے ہی قربانیاں دیں۔ انصار کا خیال تھا کہ خلافت ہمارا حق ہے کہ ہم نے مرکز قائم کرنے کیلئے ہر قسم کی سختیاں اور مخالفتیں برداشت کیں مہاجرین کو اپنے مال وغیرہ میں حصہ دار بنایا۔ کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضور ﷺ کی حدیث ((الائمة من قریش)) (۲۶) سنائی جس پر تمام خاموش ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت ابو بکرؓ کا ہاتھ پکڑ کر بیعت کا آغاز کیا اور پھر تمام نے بیعت کر لی۔
- ۴۔ اصول کی روشنی میں خبر کی تصدیق کرنے میں اختلاف جیسے ابن ابی ملیکہؓ کی روایت ہے کہ جب حضرت عثمانؓ کی بیٹی فوت ہوئیں ہم لوگ وہاں گئے تو عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن عباسؓ بھی وہاں موجود تھے۔ ابن عمرؓ نے عمرو بن عثمانؓ کو کہا کہ آپ لوگوں کو رونے سے کیوں نہیں روکتے حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا ((ان المیت لیعذب بیکاء اہلہ علیہ)) تو ابن عباسؓ نے ایک واقعہ سنایا کہ جب حضرت عمرؓ زخمی ہوئے تو صہیب

رومیؒ (۳۸ھ) نے لگے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ صہیب مجھ پر رو رہے ہو حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ((ان ا لمیت لیعذب بیکاء اہلہ علیہ)) ابن عباس فرمانے لگے کہ حضرت عمرؓ جب دنیا سے رخصت ہو گئے تو میں نے یہ سارا واقعہ حضرت عائشہؓ کے سامنے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عمرؓ پر رحم کرے حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ مؤمن جب فوت ہو جائے تو اہل خانہ کے رونے کی وجہ سے اس کو عذاب ہوتا ہے بلکہ حضور ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ ((ان اللہ لیزید الکافر عذابا بیکاء اہلہ علیہ)) یعنی اللہ تعالیٰ کافر کے اہل خانہ کے اس پر رونے کی وجہ سے اس کے عذاب میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس پر قرآن کے دیئے گئے اصول سے استدلال کیا۔ فرماتی ہیں ”حسبکم القرآن“ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَى﴾ [الاسراء ۱۵] (۲۷)

تابعین اور اصول استنباط:

صحابہ کرامؓ کی تربیت کے نتیجے میں تابعین کی ایک جماعت تیار ہوئی۔ جن میں ایک طرف فقہاء سبعہ تھے جنہوں نے اہل مدینہ کے تمام علم کو محفوظ کر لیا اور انہی کے شاگردوں سے امام مالکؒ (۱۷۹ھ) نے علم حاصل کیا اس لحاظ سے امام مالکؒ کی کتاب المؤطمانے تمام اہل مدینہ کے علوم و فتاویٰ پر مبنی ایک مجموعے کے طور پر اساس فراہم کر دی۔ دوسری طرف اہل عراق جن کے سامنے حضرت عمرؓ کے فتاویٰ کے علاوہ حضرت علیؓ اور حضرت ابن مسعودؓ کے استنباط تھے جو اہل عراق کیلئے مرجع کی حیثیت رکھتے تھے (۲۸) مدینہ منورہ جو حجازی فقہ کا مرکز تھا، اس میں اصول استنباط یہ کارفرما تھا کہ کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ ﷺ اور اس کے بعد فقہاء سبعہ کا جس مسئلے پر اجماع ہو اس کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور عراقی فقہ کا اصول یہ تھا کہ کتاب اللہ کے بعد سنت رسول اللہ ﷺ اور اس کے بعد اجتہاد کی اساس پر فتویٰ دینا اس اعتبار سے بنیادی طور پر دو ہی طریق استنباط تھے ایک حجازی اور دوسرا عراقی۔

عبدالقاہر بغدادی (۴۴۹ھ) فرماتے ہیں جب کسی مسئلے پر حضرت علیؓ، حضرت زیدؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ متفق ہوتے ہیں تو اس میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن جس مسئلے میں زید بن ثابتؓ اپنے تین ساتھیوں سے الگ موقف اختیار کرتے ہیں تو امام مالکؓ اور امام شافعیؒ اکثر ان کے ہم نوا ہوتے ہیں اور اگر ابن مسعودؓ اپنے تین احباب سے اختلاف کرتے ہیں تو علقمہ اور اسودان کی رائے کو لیتے ہیں۔ (۲۹)

فقہاء اربعہ اور ان کے اصول استنباط:

امام شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں اصول فقہ میں مذکور مسائل دو قسم کے ہیں ایک قسم وہ ہے جو لغت کی روشنی میں حل کئے جاتے ہیں جیسے عام، خاص، نص، ظاہر وغیرہ یہ اسی طرح ہے جیسے نحو یوں کے ہاں اسم نکرہ اور معرفہ ہوتا ہے اس قسم میں کچھ زیادہ اختلافات نہیں پیدا ہوتے۔ دوسری قسم وہ جس میں عاقل کیلئے اشارات موجود ہوں اور ہر ذی عقل اپنے انداز سے اس کو پڑھے یا سمجھے اس کی مثال اسی طرح ہے کہ ایک کتاب کے حروف دھندلے ہو گئے ہوں اور دو افراد سے اس کی عبارت پڑھوائیں تو ہر ایک ان میں سے جو اس کے ذہن کے قریب ہوگا وہی پڑھے گا اسی طرح جب فقہاء نے ایسی قابل احتمال احادیث کو دیکھا اور اس میں غور کیا تو کسی نے ایک احتمال کو منسوخ قرار دیا کسی نے اسے راجح قرار دیا اور کسی نے متعدد احتمالات میں تطبیق پیدا کی اور یہ انداز جب ان کے متبعین میں منتقل ہوئے تو مسلک کی شکل اختیار کر گئے۔ (۳۰)

اس اصول پر پیدا ہونے والے اختلافات میں ہر رائے پر ایک طبقہ تعلیم و تعلم کا راستہ اختیار کرتا ہے تو المدارس العلمیہ یا الجمعۃ العلمیہ کہلاتا ہے۔ جب ایک رائے کے حاملین کے خیالات اور فتاویٰ ہر طبقے کے لوگوں تک پہنچ جاتے ہیں اور انہی تلقی بالقبول حاصل ہو جاتی ہے تو وہ طریقہ متبعہ کہلاتا ہے اور جب ان کے ہاتھ قوت نافذہ آجائے تو وہ مذہب بن جاتا ہے۔ اس دوسری قسم میں ایک طبقے نے اہل مدینہ کے اجماع کو حجت مانتے ہوئے اجتہاد سے نسبتاً کم کام لیا ہے اور یہ طریقہ امام مالکؒ کا ہے یہ لوگ اہل الحدیث کہلاتے ہیں اور عراقیوں نے قیاس اور اجتہاد کا راستہ اختیار کیا تو وہ اہل الراۃ کہلائے اور اس اصول کو احناف نے لیا ہے ان دونوں کے امتزاج سے مستقل اصول استنباط سامنے آیا اور وہ اس لئے کہ امام شافعیؒ مدینہ سے امام مالکؒ کے شاگرد بھی تھے اور عراق سے امام محمد بن حسن شیبانی کے شاگرد بھی تھے۔ اور یہ ایک مستقل مذہب قرار پایا۔ اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ نے زیادہ تر عراقیوں سے علم حاصل کیا لیکن وہ بلند پایہ محدث بھی تھے اس طرح ان کا اصول استنباط ایک مستقل مذہب کے طور پر سامنے آیا۔ (۳۱) گویا مالکی فقہ کا دار و مدار اہل مدینہ کے عمل پر ہے احناف کی فقہ کا دار و مدار حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ کی فقہت اور اجتہاد پر ہے اور شوافع کے ہاں ایک بڑا حصہ تعامل اہل مدینہ کی بنیاد پر ہے اور یہ سلسلہ مصر وغیرہ کی طرف چلا ہے اور دوسرا حصہ اہل عراق کے مزاج کے مطابق ہے اور اس انداز فکر پر مبنی طریق کار خراسان وغیرہ کے علاقے میں رائج ہوا ہے۔

قرآن حکیم سے فقہاء کرام کے اصول استنباط کی مثالیں:

فقہاء کے زاویہ نگاہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے جب اصول فقہ کی اصطلاحات مدون ہوئیں تو ان کی تشریحات بھی مختلف نظر آئی ہیں۔ مثلاً:

عام اور خاص سے مسئلہ اخذ کرنے میں فرق:

عام کا لغوی مفہوم: لغت میں عام کا اطلاق اس جملے یا کلام پر ہوتا ہے جس میں شمول ہو یعنی جس میں حکم بہت سارے افراد کو شامل ہو (۳۲) اصطلاح میں عام کی تعریف یہ ہے "اللفظ المستغرق لجميع ما يصلح له بحسب وضع واحد دفعةً بلا حصر" (۳۳) یعنی عام وہ لفظ ہوتا ہے جو بغیر کسی شرط اور قید کے اپنے ایک ہی صیغے میں تمام ممکنہ مفاہیم و معانی کو شامل ہوتا ہے۔

جبکہ خاص لغت میں اس کلام کو کہتے ہیں جو کسی فرد پر بلا شرکت غیر منطبق ہو (۳۴) اور اصطلاح میں خاص کی تعریف یہ ہے "تخصیص العام قصره على بعض افرادہ بدلیل متصل او منفصل" (۳۵) یعنی کسی دلیل متصل یا منفصل کے ذریعے حکم کو بعض افراد کے ساتھ خاص کر دینا۔

عام کے بارے میں امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کی رائے:

مذکور تین ائمہ کے نزدیک ایسے عام کی دلالت اس کے افراد پر ظنی ہوتی ہے یعنی ہر عام میں اس کے بعض افراد داخل نہ ہونے کا یعنی تخصیص کا احتمال ہوتا ہے اسی وجہ سے عام کی تاکید لفظ کل اور جمعین وغیرہ سے آتی ہے اور اسی بناء پر یہ قاعدہ ہے "مامن عام الاخص عنه البعض" جبکہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ عام کی دلالت اس کے افراد پر قطعی ہوتی ہے البتہ کسی دلیل سے کچھ افراد مستثنیٰ کر دیئے جائیں تو پھر بقیہ پر دلالت ظنی ہو جاتی ہے اور دوسرے بعض افراد کے داخل نہ ہونے کا احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔

شمرہ اختلاف:

مذکورہ اصول کے تناظر میں جن جزوی مسائل میں اختلاف ظاہر ہوتا ہے ان میں ایک کو بطور مثال ذکر کیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خبر واحد اور قیاس سے عام کی تخصیص جائز ہے یا نہیں؟ احناف کے نزدیک چونکہ عام کی دلالت قطعی ہوتی ہے اس لئے اس کی تخصیص کسی ظنی دلیل یعنی خبر واحد یا قیاس سے جائز نہیں ہے ورنہ مطلب یہ ہوگا کہ اعلیٰ پر ادنیٰ اور قطعی پر ظنی کی برتری تسلیم کر لی گئی ہے صرف حدیث متواتر یا مشہور سے تخصیص کی جاسکتی

ہے۔ البتہ اگر عام کی تخصیص پہلے ہوگئی ہو تو پھر اس کی دلالت ظنی ہو جاتی ہے اور برتری کا سوال ختم ہو جاتا ہے مثلاً ﴿أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِنْ وُجْدِكُمْ وَلَا تَضَارُوهُنَّ لِنُضَيْبِغُوا عَلَيْهِنَّ﴾ [الطلاق ۶] اس آیت سے طلاق کے بعد عورت کیلئے زمانہ عدت میں خاوند پر نان نفقہ اور رہائش کا ثبوت ملتا ہے اور یہ آیت ہر مطلقہ کیلئے عام ہے جس نوعیت کی طلاق بھی ہو اس کی تخصیص اس خبر واحد سے نہیں کی جاسکتی جس میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت فاطمہ بنت قیس (جن کو طلاق بائن دی گئی تھی) کیلئے نان نفقہ اور مکان واجب قرار نہیں دیا چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی کے بارے میں فرمایا تھا کہ ((لا تترك كتاب ربنا و سنة نبينا ﷺ بقول امرأة لاندري لعلها حفظت او نسيت)) (۳۶) احناف کے مسلک کی تائید کیلئے یہ مضبوط دلیل ہے۔ شواہد اور حنا بلہ کے ہاں عام کی دلالت اس کے افراد پر ظنی ہوتی ہے اس لئے ظنی کی تخصیص ظنی چیز یعنی خبر واحد اور قیاس سے کی جاسکتی ہے۔ اس کی تائید میں وہ صحابہ کرام کی بیان کردہ تخصیص پیش کرتے ہیں۔ اور وہ اس آیت میں ہے ﴿وَأَحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ﴾ [النساء ۲۴] اس سے پہلے دو عورتوں کے ایک مرد کے نکاح میں جمع ہونے کے حوالے سے صرف دو بہنوں کا ذکر ہے اور اس آیت مذکورہ میں عموم اس پر دال ہے کہ اس کے علاوہ کسی دو عورتوں کا ایک مرد کے بیک وقت نکاح میں جمع ہونا حلال ہے جبکہ حدیث میں آتا ہے ((لا يجمع بين المرأة وعمتها ولا بين المرأة وخالتها)) (۳۷) یہ خبر واحد ہے اور صحابہؓ کا اجماع ہے کہ دو بہنوں کی طرح پھوپھی بھتیجی اور خالہ و بھانجی کو جمع کرنا بھی ناجائز ہے۔ اس سے وہ خبر واحد سے عام کی تخصیص کا جواز لیتے ہیں جبکہ احناف کے ہاں یہ حدیث مشہور ہے اور حدیث مشہور سے تخصیص ہو سکتی ہے اور مالکیہ کے نزدیک اس کی تخصیص کی وجہ تعامل اہل مدینہ ہے کہ وہ اس کی تائید میں ہے اگر اہل مدینہ کا تعامل اس کی تائید نہ کرتا ہو تو مالکیہ کے نزدیک بھی تخصیص جائز نہیں ہے۔

حوالہ جات

- ۱- ابن فارس (۳۹۵ھ) معجم مقاییس اللغة مادة ضبط: ص ۹۷۲
- ۲- الجرجانی (۸۱۶ھ) علی بن محمد، التعريفات: ص ۳۸
- ۳- ابن منظور (۷۱۱ھ) لسان العرب مائة "جهد"
- ۴- الشاطبی (۷۹۰ھ) ابواسحاق، الموافقات في أصول الشريعة مع شرح عبداللہ دراز۔ المکتبۃ التجاریۃ الکبری القاہرۃ (س۔ن) کتاب الاجتهاد: ۱۳۲/۴
- ۵- ابوداؤد (ت ۲۷۵ھ) السنن باب اجتہاد الرأی فی القضاء حدیث نمبر ۳۱۱۹
- ۶- مسند احمد۔ مسند عائشہ حدیث نمبر ۲۳۱۵۰
- ۷- الترمذی (۲۷۹ھ) السنن مناقب عمر بن الخطاب حدیث نمبر ۳۶۱۵
- ۸- شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۳ء) فقہ عمر مترجم ابوحنیفی امام خان نوشہروی۔ علم و عرفان پبلشرز لاہور ۲۰۰۵ء
ص: ۳۵۶-۳۶۶
- ۹- ابن عبدالبر (۴۶۳ھ) الاستیعاب: ۳۰۲/۱
- ۱۰- عبید اللہ سندھی، مولانا (۱۹۴۴ء) شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، ط محمود اکیڈمی لاہور (س۔ن):
ص ۸۹
- ۱۱- فقہائے سبعہ یہ ہیں: عروہ بن زبیر (۹۳ھ) سعید بن المسیب (۹۴ھ) ابوبکر بن عبدالرحمن (۹۴ھ) عبید اللہ بن عبداللہ (۹۸ھ) خارجہ بن زید (۹۹ھ) قاسم بن محمد (۱۰۷ھ) سلیمان بن یسار (۱۹۷ھ)
- ۱۲- شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص ۹۰
- ۱۳- ایضاً: ص ۹۰-۹۱
- ۱۴- الرازی (۶۰۶ھ) محمد بن عمر بن الحسن فخر الدین، مفساتیح الغیب (۳/ ۳۷۷) داراء حیات التراث، بیروت، الطبعة الثالثة بدون سن طبع
- ۱۵- عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فسح با سم ربك العظيم نازل ہوئی تو حضور ﷺ نے فرمایا اجعلوها فی رکو عکم اسکو اپنے رکو ع میں کرلو اور جب سبح اسم ربك الا علی

- نازل ہوئی تو فرمایا اجعلوہا فی سجود کم اسکو اپنے سجدے میں کرلو۔
 ابو داؤد، سلیمان بن اشعث (۲۷۵ھ السنن باب ما یقول الرجل فی رکوعہ و سجودہ۔ حدیث رقم ۳۶۷
- ۱۶۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل الامام، الجامع الصحیح، کتاب الصلوٰۃ، باب کیف فرضت الصلوٰۃ فی الاسراء۔ حدیث ۳۳۷
- ۱۷۔ شاہ ولی اللہ دہلوی (۱۷۶۳ء)، حجة اللہ البالغۃ، تعلیق محمود طعمہ حلبي، دار المعرفہ بیروت، طبع دوم ۲۰۰۴/۱۶-۲۱-۲۲
- ۱۸۔ القرطبی (۶۷۱ھ) محمد بن احمد، الجامع لأحكام القرآن: ۳۹/۱
- ۱۹۔ الترمذی، محمد بن اسماعیل (۲۷۹ھ) السنن، باب ما جاء فی رويۃ الرب تبارک
- ۲۰۔ مسلم بن الحجاج امام (۲۶۱) صحیح مسلم باب فضل الرمی والحث علیہ حدیث ۳۵۳۱
- ۲۱۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، الجامع الصحیح باب ظلم دون ظلم: حدیث نمبر ۳۱
- ۲۲۔ القرطبی (۶۷۱ھ) الجامع لأحكام القرآن: ۱۵۹/۶
- ۲۳۔ محمد تقی امینی، اجتهاد، قدیمی کتب خانہ کراچی: ص ۵۷
- ۲۴۔ الشاطبی (۷۹۰ھ) الموافقات فی أصول الشریعة: ۳۸۴/۳
- ۲۵۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، الجامع الصحیح: حدیث نمبر ۸۹۴
- ۲۶۔ احمد بن حنبل (۲۴۱ھ) مسند انس بن مالک: حدیث نمبر ۱۱۸۵۹
- ۲۷۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، ابو عبد اللہ، الجامع الصحیح: حدیث نمبر ۱۲۰۶، ۳۶۸۱
- ۲۸۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، امام (۱۷۶۳ء) مقدمة المصنفی شرح المؤطا ط۔ کراچی (س۔ن): ۳۴/۱
- ۲۹۔ عبد القاهر، ابو منصور، التتمیمی، البغدادی (۴۴۹ھ) أصول الدین دارالکتب العلمیہ بیروت ۱۹۹۵ء: ص ۳۱۱
- ۳۰۔ شاہ ولی اللہ دہلوی، امام (۱۷۶۳ء) عقد الجید فی احکام الاجتهاد والتقلید مترجم از ڈاکٹر محمد میاں صدیقی طبع اول ۲۰۰۰ء شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد: ص ۷۰-۱۷
- ۳۱۔ عبید اللہ سندھی، مولانا (۱۹۴۴ء) التمهید لتعریف أئمة التجديد تحقیق مولانا غلام مصطفی قاسمی طبع اول ۱۹۷۶ء لجنۃ احیاء الادب السندي جامشورو: ص ۳۵۱-۳۵۲

- ۳۲۔ ۱۳۔ احمد بن فارس (۳۹۵ھ) معجم مقاییس اللغة: ۱۸/۴
- ۳۳۔ الآمدی، علی بن ابی علی (۶۳۱ھ) الإحکام فی أصول الأحکام دارالکتب العلمیة بیروت
۱۴۰۰ھ: ۲/۲۸۶
- ۳۴۔ ۱۵۔ ابن قدامہ، عبداللہ بن احمد، المقدسی (۶۲۰ھ) روضة الناظر و جنة المناظر دارالکتب العربی
بیروت طبع اول ۱۴۰۱ھ: ص ۱۹۴
- ۳۵۔ ۱۶۔ الآمدی الإحکام ۲/۴۰۷
- ۳۶۔ الترنذی (۲۷۹ھ) السنن: حدیث نمبر ۱۱۰۰
- ۳۷۔ البخاری (۲۵۶ھ) محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح: حدیث نمبر ۴۷۱۷